زبیرالحسن غافل: ایک سنجیدہ ظریف

صفدرامام قادری
صدر، شعبہ اردو، کالج آف کامرس آرٹس اینڈ سائنس
پاٹلی پترا یونیورسٹی، پٹنہ

زبیرالحسن غافل کل وقتی شاعر نہیں تھے۔ ہماری زبان میں ہمہ وقت شعر و ادب کے کاموں میں ڈوبے ہوئے افراد ہر جگہ نظر آتے ہیں۔ فنافی الشعر یا فنافی العلم جیسی اصطلاحیں ہماری زبان میں بڑے احترام سے استعمال کی جاتی ہیں۔ حالاں کہ ایسے شعرا و ادبا میں بڑی تعداد ان لوگوں کی ہوتی ہے جو سو دو سو غزلیں کہہ پائے یا بیس پچیس مضامین یا افسانے رقم کر سکے مگر چالیس پچاس برس اپنی حرکات سے ہمیں یہ باور کراتے رہے کہ وہ سوتے جاگتے اور جیتے مرتے ادب کی ہی خدمت کرت رہے۔ زبیرالحسن غافل نے جب اپنا شعری مجموعہ پیش کیا تب بھی ایسا کوئی دعوا پیش نہیں کیا۔ جو شخص اپنا تخلص غافل رکھے، اس کے بارے میں یہ کہا ہی جا سکتا ہے کہ داد خواہی اور احساس برتری کے تاج سنبھالنے کے مقاصد سے سوچ سمجھ کر کوئی تخلص انہوں نے نہیں رکھا۔ وہ عاقل ہو سکتے تھے مگر وہ خود کو غافل کے طور پر کوچۂ شعر میں ہمارے سامنے لے آئے۔

اردو کی روایت میں شعر میں وہ دونوں پہلوؤں سے اجتہاد کرتے ہیں۔ کل وقتی شاعر یا مکمل شاعر ہونے کا انہوں نے شاید ہی کبھی خواب دیکھا ہو۔ وہ سنجیدہ اور مزاحیہ دونوں انداز میں شعر کہتے تھے۔ اس لیے بہت سوچ سمجھ کر ایک ایسا تخلص اختیار کیا جس سے دونوں دنیاؤں کی سیر سبک روی کے ساتھ ممکن ہو سکے۔ انھیں اپنے خاندان کے بزرگوں سے روایت کے طور پر اردو اور

فارسی کا ماحول ملا۔ ملازمت کے دوران مختلف شہروں کی خاک چھانتے ہوئے وہ عظیم آباد پہنچے، اس وقت اس بات کی گنجائش پیدا ہوئی کہ وہ اپنی ادبی زندگی کو ایک شکل دے سکیں۔ رضا نقوی واہی سے لے کر مشتاق احمد نوری تک ان کی حوصلہ افزائی اور قدر دانی کرنے والے لوگ بھی انہیں ملتے گئے۔ اولاد میں بھی یہ شعور پیدا ہوا کہ ان کا منتخب کلام کتابی شکل میں سامنے آئے۔ ایک اوسط ضخامت کا مجموعہ اس طرح سامنے آیا جسے نہ اردو زبان کے لیے کوئی انقلاب آفریں کارنامہ کہہ سکتے ہیں اور نہ اس مجموعے سے یہ بات بھی سمجھ میں آتی ہے کہ زبیر الحسن غافل بھی اپنی شاعرانہ شخصیت کا اتنا اونچا مول نہیں رکھتے ہیں۔

مگر ادب کی تاریخ کے مطالعے سے قدم قدم پر جز وقتی لکھنے والے نظر آتے ہیں۔ کسی نے پانچ برس شعر کہے، دس برس فوج میں ملازمت کر لی، ایک عشرہ کسی دوسرے کام میں گزار کر پھر نہ جانے کس عالم میں کسی دوسرے شعبہ علم کی طرف مڑ گیا۔ ہزاروں ایسے مصنفین وہاں ملتے ہیں جنہوں نے ایک ہی ناول لکھا یا ایک مختصر سا شعری مجموعہ ان سے یادگار ہے۔ پھر وہ کوچۂ ادب کی طرف نہیں آئے مگر دنیا کی ادبی تاریخ انہیں احترام کے ساتھ یاد رکھتی ہے۔ زبیر الحسن غافل کو پڑھتے ہوئے ہمیں اپنی زبان میں یہ پیمانہ ملحوظ رکھنا چاہیے کہ انہوں نے خود کو ماں کے پیٹ سے لے کر قبر تک کا ادبی خدمت گار نہیں مانا۔

یہاں سوال ضرور توجہ طلب ہے کہ ان کو کس انداز کا فن کار تسلیم کیا جائے؟ ابھی چند دہائیاں پہلے ہمارے معاشرے میں ایسے لوگ مل جاتے تھے جو ادیب یا شاعر تو نہیں ہوتے تھے مگر انہیں موقع و محل کے مطابق اشعار یاد ہوتے تھے۔ گفتگو میں اردو اور فارسی کے ضرب الامثال اور روزمرہ چھلکتے دکھائی دیتے تھے۔ داستانوں سے لے کر دیوان غالب، مسدس حالی اور آب حیات جیسی کتابیں ان کے مطالعے سے گزر چکی ہوتی تھیں۔ شاعروں، ادیبوں کے قصے اور کہانیاں وہ دل چسپی سے سنتے اور سناتے تھے۔ وہ مدرسے کے عالم ہوں یا طب پیشہ افراد، صحافت پیشہ ہوں یا کلرک مگر اردو کی ایک مجلسی دنیا سے نکلے یہ افراد ہوتے تھے۔ سعدی، حافظ اور مولانا روم سے لے کر علامہ اقبال تک کا سرمایہ سخن ان کے سینے میں محفوظ تھا۔ ہر گھر میں اردو اور فارسی کی چھوٹی بڑی لائبریری ہوتی تھی۔ ایک گھر سے دوسرے گھر تک پڑھنے کے لیے کتابیں لینے دینے کا رواج تھا۔

اس سے اپنے آپ گھر اور بازار، مسجد اور محل ہر جگہ صاف ستھرا ادبی ذوق دیکھنے کو ملتا تھا۔ ہر آدمی کی گھریلو تربیت اسی خوشگوار ماحول میں ہوتی تھی۔

زبیرالحسن غافل اسی ماحول کے زائیدہ ہیں۔ یہ ماحول آزادی سے پہلے تو ہر گاؤں اور بستی میں موجود تھا جسے تقسیم ملک کے بعد کچھ سیاسی جبر، کچھ اپنی کوتاہیوں کے سبب ہم نے کھویا۔ زبیرالحسن غافل کا خانوادہ سماجی اور معاشی ترقی سے دور تھا اور وہ بہار کے ایک ایسے خطے سے آتے تھے جسے کم ترقی یافتہ کہا جاسکتا ہے۔ اسی وجہ سے وہ اپنے بزرگوں کی بنائی ہوئی اور کمائی ہوئی تہذیبی دولت کو سنبھال پانے میں کامیاب ہوئے، ورنہ ان کا پیشہ اور تعلیمی دائرہ کار ہرگز اس بات کے مواقع نہیں دے سکتے تھے کہ وہ اپنی مادری زبان اور شعروادب کی خدمت کرسکیں۔ قانون کا پڑھنا اور قانون کی رو سے فیصلے کرنا ان کے لیے اتنے برے کام تھے کہ وہ سچے ذوق کے پروردہ نہیں ہوتے تو اردو کہیں ان کے قریب بھی نظر نہیں آسکتی تھی۔

ان کے مجموعے کلام میں سب سے واضح حصہ ظرافت کا ہے۔ وہ خود بھی اپنی اولین پہچان ظریفانہ شاعر کی حیثیت سے ہی پیش کرتے ہیں۔ حالاں کہ ان کے مجموعے کلام میں سنجیدہ شاعری، خاص طور سے طرحی غزلیں معقول تعداد میں موجود ہیں۔ جس سے ثابت ہوتا ہے کہ وہ اپنے ادبی امکانات کی تلاش میں سرگرداں رہے۔ ہماری ادبی تاریخ شاہد ہے کہ جس شاعر نے سنجیدہ شاعری کے ساتھ ساتھ ظریفانہ شعر بھی کہنے شروع کردیے تو اس کین حقیقی پہچان پر ظرافت کا رنگ غالب آگیا۔ اکبر اور سودا کی مثالیں تو موجود ہیں جن کے ظریفانہ کلام نے ان کے ادبی کاموں کے دوسرے پہلوؤں سے ہمیں ذرا دور کردیا۔ آج کی گفتگو میں ہماری کوشش ہوگی کہ زبیرالحسن غافل کے شاعرانہ اوساف کے تمام پہلوؤں پر اشارے کیے جائیں اور ان کے ادبی مرتبے کے تعین کے لیے ان کے سرمایۂ سخن کے بنیادی مزاج کو سمجھنے میں کامیابی حاصل کی جائے۔

زبیرالحسن غافل کا شعری مزاج کلاسیکی ادبی ماحول کا پروردہ ہے۔ یہ بات بھی سمجھ میں آتی ہے کہ اردو کی کلاسیکی شاعری سے وہ اچھے خاصے واقف ہیں۔ اسی کے ساتھ یہ بھی روشن ہے کہ وہ صنف نظم کے فنی تقاضوں کو بہ حسن خوبی سمجھتے ہیں۔ ان کی ظریفانہ شاعری میں ان کی یہ صفات کھل کر سامنے آتی ہیں۔ مسدس، مثنوی اور غزل تینوں ہیئت میں ان کا ظریفانہ کلام ہمیں ایک بار

پھر اس کے لیے یقین بہم پہنچاتا ہے کہ وہ کلاسیکی شاعری کے اچھے خاصے تربیت یافتہ ہیں۔اس میں ادب اور سیاست کے موضوعات بھرے پڑے ہیں۔ظریفانہ شاعری ایک پہلو سے مشکل اس لیے ہے کہ شاعر چلتے پھرتے کچھ ایسے نشانات مقرر کر لیتا ہے جس سے محفوظ رہ پانا مشکل ہے۔ خاص طور سے اس آدمی کے لیے جو ایک نظام کا حصہ ہے۔وہ ظریفانہ نظم آخر کہے تو کیسے کہے۔ غزل کے شاعر کے لیے گنجائشیں ہوتی ہیں۔وہ مشاہدۂ حق میں بادہ وساغر کو شامل کر کے اپنی بات بلخصوص ناگفتنی کو بھی دنیا کے سامنے پیش کر دیتا ہے۔

زبیرالحسن غافل نے اپنے آس پاس کے موضوعات پر اعتبار کیا اور انہیں اپنے ادب کا حصہ بنایا۔ان کے مجموعۂ کلام کے ظریفانہ حصے کی دوسری ہی نظم کا عنوان ''رشوت'' ہے۔مسدس کی ہیئت میں یہ نظم لکھی گئی ہے۔شاعر کو معلوم ہے کہ یہ ہیئت اردو میں طول نگاری کے لیے بہت موزوں ہے۔نظیر اکبرآبادی، علامہ اقبال، چکبست اور تمام مرثیہ گویوں نے مسدس کی ہیئت میں طول طویل تخلیقات پیش کی ہیں۔شاعر اس سلسلے سے اپنی معروضات پیش کرتا ہے۔ایک کے بعد ایک مثالیں آتی جاتی ہیں اور سلسلہ کلام بڑھتا رہتا ہے۔زبیرالحسن غافل بھلے غافل تخلص کریں مگر اس صنف کے روایتی تحفظات سے وہ واقف ہیں۔''رشوت'' نظم میں اس بات کے امکانات کم نہیں تھے کہ وہ ایک کے بعد دوسری مثالیں پیش کرتے جائیں اور مخاطبت طول تر ہا جائے۔نظم ''رشوت'' کا آخری شعر اور اس کا آخری مصرع بہ غور ملاحظہ کرنا چاہیے۔

انکار سجدہ کردے، کسی میں یہ دم نہیں
دنیا میں یہ خدا سے کسی طرح کم نہیں

آخری مصرع پڑھتے ہوئے نظیر اکبرآبادی کی نظم ''خودشامد'' کا وہ لازوال مصرع یاد آتا ہے:

سچ تو یہ ہے کہ خوشامد سے خدا راضی ہے

زبیرالحسن غافل نے بیان میں مبالغہ سے اپنی ظرافت کو نہ صرف یہ کہ اعتبار بخشا ہے بلکہ یہاں طنز سے اس کلام کا وقار بھی بلند ہوتا ہے۔

زبیرالحسن غافل نے اپنی ظریفانہ شاعری کے موضوعات اپنے آس پاس سے منتخب کیے جس کے سبب بار بار بہار کا سماج اور بہار کی سیاست کے جلوے سامنے آتے ہیں۔بہار کے مشہور

چارہ گھوتالے پر غافل صاحب کی نظم ''چارہ گر'' سامنے آئی۔ زبیرالحسن غافل کو یہ معلوم تھا کہ اگر عنوان کی مزید تشریح نہ کی جائے تو پڑھنے والے کچھ دوسرے معنی بھی اخذ کر سکتے ہیں۔ اس لیے قوسین میں انہوں نے ''بہار میں چارہ گھوٹالے سے متعلق'' کا اضافہ کیا۔ نظم مثنوی کی ہیئت میں ہے اور ترتیب وار باتیں کہنے کی کوشش کی گئی ہے۔ واقعات حقائق کے بطن سے طاہر ہوئے ہیں۔ شاعر نظم ختم کرنے سے پہلے اپنی تشویشات سے ہمیں باخبر کر دیتا ہے۔ ان کا مصرع ملاحظہ کیجیے:

جانور کے چارہ سے انسان جب پلنے لگا

یہ صرف حقیقت کا تذکرہ نہیں ہے بلکہ یہاں عالم انسانیت کے پیش نظر ایک نفسیاتی سوال قائم کر دیا گیا ہے۔ اس کے کئی جوابات ہو سکتے ہیں۔ اتنا تو سچ ہے کہ انسان کے جانور بننے یا انسان کے اندر جانور کی صفات ہونے یا درندگی پر زبیرالحسن غافل سوالات قائم کر رہے ہیں۔ نظم ختم ہوتے ہوتے شاعر چارہ گھوٹالے سے ہمیں آگے لے جاتا ہے۔ کسی فن کار کے لیے یہ بڑی کامیابی ہے کہ وہ اپنے موضوعات کے آس پاس تو رہے مگر وہ اس سے ماسوا بھی دیکھے اور دکھائے۔ زبیرالحسن غافل نے ''چارہ گر'' نظم میں اپنی شاعری کے یہ امکانات تلاش کر لیے ہیں۔

''بہار کی موجودہ حالت'' نظم میں بات سڑکوں کی حالت سے شروع ہوئی ہے۔ دوسرے ہی مصرعے میں ظرافت اپنے عروج پر ہے۔ مصرع پیش ہوتا ہے:

بیل گاڑی کا مزہ آنے لگا ہے کار میں

مریض کو اسپتال لے جانے سے منع کیا جا رہا ہے کہ ابھی اس کی جان باقی ہے۔ یوں تو سارے کاروبار صوبے میں ٹھپ پڑے ہیں مگر شاعر بتاتا ہے کہ منافع کا ایک کاروبار ہے اور وہ اغوا کا کام ہے۔ مزید ابتری کی حالت بتاتے بتاتے شاعر اس مقام تک ہمیں پہنچاتا ہے:

ہیں تو تینوں ہی لٹیرے، یہ ذرا بتلایئے
فرق ہے کیا چور ہیں، نیتا میں، تھانے دار میں

اس شعر تک آتے آتے شاعری اپنے موضوع کے اعتبار سے بے حد دل چسپ اور معرکۃ الآرا ہے۔ اردو کے حکومت کی زھان بننے کے معاملات اس نظم میں زیر بحث آئے ہیں۔ شاعری میں ظرافت کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تو ہے ہی مگر وہ دانش ور بھی ہے۔ فصیل وقت پر لکھی

ہوئی باتیں وہ بھلا نہیں سکتا۔ تاریخ سے بھی اسے نہ جانے کتنے سبق حاصل ہو چکے ہیں۔ شاعر نے امکانات کو نگاہ میں رکھا اور مبالغے کی بنیاد پر اپنی نظم کا ہوائی قلعہ تیار کیا۔ شاعر اندازہ کرتا ہے کہ تھوڑے امتحانات دے کر مترجم بننے والے لوگوں کی اگلی زندگی کیا ہوگی؟ ایسے امتحانات میں اصطلاحوں کے اردو، ہندی ترجموں پر خاصا زور رہتا ہے، اس لیے شاعر نے یہ محسوس کیا کہ جو اردو داں آبادی بالخصوص شاعر اور ادیب اپنی اردو دانی کی بنیاد پر اس کوچے کی سیاحی میں نکلے ہیں، وہ کل سرکار کی اس بھٹی سے کندن بن کر نکلیں گے یا کہ کوئلہ۔ اس موضوع پر یہ عجیب وغریب نظم ہمارے سامنے آتی ہے۔ شاعر اور ادیب کس طرح سرکاری ملازم بنے، اس کی ترکیب شاعر نے یوں بتائی ہے:

ٹائپنگ اردو کی سیکھی، رٹ گئے شبداولی
تھوڑی محنت سے ہی لکھنا آ گئی دیونا گری
کچھ دنواں میں ہوگئی قسمت کی دیوی مہرباں
بن گئے سرکار کے نوکر یہ سب اہل زباں

یوں تو یہ ایک عام سا موقع تھا۔ حکومت نے اردو کے لیے بند دروازے کھولے اور ترجمے کی مہارت کی جانچ پرکھ کر کے لوگوں کو ملازمت دی۔ زبیر الحسن غافل اس کے آگے کا حال تخیل کی آنکھ سے دیکھنا چاہتے ہیں۔ سرکاری دفتروں میں ان کی پوری زندگی گزری، اس لیے انہیں معلوم تھا کہ یہاں کوئی جس رنگ کا بھی آئے، وہ سرکار کے رنگ میں رنگ جائے گا۔ وہ ملازمت منصفی میں کر گزار رہے تھے، وہاں بھی پہلی سرکاری زبان کے داخلے کے جبر اور زور کو ملاحظہ کر رہے تھے۔ اس لیے ان کے اندیشے ہمارے لیے توجہ طلب ثابت ہوئے۔ فن ترجمہ پر اس بہانے جو عتاب نازل ہونے والا تھا، اس کی ایسی تصویر کشی اس نظم میں کی گئی ہے جیسے یہ کوئی کائناتی صداقت ہی ہے۔ آج یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ شاعر نے مبالغے کی آنکھ سے اور مشاہدے اور تجربے کی صلاحیت سے جو صورت حال واضح کی ہے، اس سے کہیں زیادہ برے حالات آج ننگی آنکھوں سے ہم دیکھ سکتے ہیں۔ آج سے غالباً تین دہائی قبل جو خدشات شاعر نے ظاہر کیے تھے، وہ پہلے انہیں کی زبان میں ملاحظہ کیجیے:

دفتروں میں ہر قسم کی فائلیں چرنے لگے
عرضیوں کا ترجمہ ہندی میں یہ کرنے لگے
ناقدوں اور ناشروں کا ڈر نہ کوئی جب رہا
یک بیک انگڑائی لے کر جوہر خفتہ جگا
پھر تو لفظوں کا نیا اک دفتر معنی کھلا
سر کی وپدا ہوگیا شوریدہ سر کا ترجمہ
حسن ظن کو کہہ گئے ناری کی سندرتا اگر
فن ظرافت کو لکھا برتن بنانے کا ہنر
ایک صاحب نے اگر کوزہ میں دریا بھردیا
دوسرے نے موج میں ساغر کو ساگر کردیا
سرخ رو ہونے کو چہرہ لال ہونا گر لکھا
دوسرے نے ماہ کامل کو مہینہ بھر لکھا

شاعر کے حس مزاح کی داد دیجیے کہ مستقبل کی دیوار پر شاہ سرخیوں کو وہ صاف صاف ملاحظہ کر رہا ہے۔ پہلے ہی شاعر نے بتا دیا کہ دفتروں میں ہر طرح کی فائلیں وہ آزمائے گا۔ پھر ذرا اعتماد آنے پر بے خوف ترجمہ کرے گا اور رفتہ رفتہ وہ دن بھی آئے گا کہ یہ سرکاری مترجم ہندی کا کفن بھی پہنائے گا۔ بات سخت ہے مگر زبیر الحسن غافل کو صاف صاف بہت کچھ نظر آ رہا ہے۔ ملاحظہ ہو ''ترک شاعر'' کا نقطۂ عروج:

دیکھنا تم ایک دن جادو جگاتا ان کا فن
میت اردو کو پہنائے گا ہندی کا کفن

اس سلسلے کی نظم ''یوم اردو'' بھی ہے۔ ابھی فروغ اردو کا موسم ہے اور اخبارات سے لے کر سوشل میڈیا تک اس اصطلاح کی ریلم پیل ہے مگر زبیر الحسن غافل کو بروقت یہ بات سمجھ میں آ گئی تھی کہ یوم اردو کا سرکاری شوشہ کس قدر غیر افادہ بخش ہے؟ سوال زبان کی جڑوں کی آبیاری کا ہے مگر حکومت ہمیں بنیادی کاموں کے بجائے پتیوں پر چھڑکاؤ کرنے کے لیے الجھا دیتی ہے۔

زبیرالحسن غافل نے اپنی نظم میں یہ سوال پوچھا کہ یوم اردو آخر کیوں کر مناتے ہیں؟ اس سوال کے پس پشت تلخ حقائق پیش کیے گئے ہیں۔ تعلیمی اداروں سے اور گھروں سے ہماری زبان رخصت ہورہی ہے مگر ہم جشن اور تماشوں پر خاص توجہ کرتے ہیں۔ ایسی صورت حال پر شاعر یوم اردو منانے کا سبب خون کے آنسو روتے ہوئے اس طرح بیان کرتا ہے:

پھر ذرا کچھ سوچ کر یوں با ادب میں نے کہا
اردوئے مرحوم کی سمجھیں اسے برسی جناب
فاتحہ کے واسطے ہی آئے ہیں شاعر یہاں
روح اردو کو اسی صورت ملے شاید ثواب

روزگار، نسخۂ لیڈری، نیا الیکشن اور منصفوں کی زندگی اور ان کے مزاج پر خاطر خواہ اشارے یہاں آگئے ہیں۔ شروع ہی میں جج حضرات کی زندگی اور اپنے خول میں بند رہنے کے معاملے کو وہ گھونگھے سے تعبیر کرتے ہیں۔ خود فریبی کی نقاب ڈالے ہوئے ہونا یا دوسرے کی عیب جوئی میں ہمہ تن مصروف ہونا جیسے معاملات ایک جج ہی اپنے پیشے کی صفت کے طور پر بیان کرسکتا ہے۔ سماج سے کٹ کر جینے کی انہیں کچھ ایسی عادت ہوجاتی ہے کہ وہ اسی دائرے کو اپنی زندگی سمجھ لیتے ہیں اور ان کی حالت کچھ ایسی ہوجاتی ہے کہ اس کا بیان شاعر کے ان مصرعوں میں ہی ملاحظہ کیا جاسکتا ہے:

چونک اٹھتے ہیں کسی کو گھر میں آیا دیکھ کر
جس طرح گھوڑا بدک جاتا ہے سایا دیکھ کر

زبیرالحسن غافل کی ظریفانہ شاعری کے اسلوب پر توجہ دیں تو ایک خاص انداز کی یکسانیت سے ہمارا سابقہ پڑتا ہے۔ عجلت میں اسے بوقلمونی کا تضاد نہ سمجھا جائے۔ یہ اسلوب غور و فکر اور دانش مندی کے اوصاف کے ساتھ وضع ہوا ہے۔ نقادوں کا ایک بڑا طبقہ ہمارے پچھلے عہد کے بے مثل ظرافت نگار رضا نقوی واہی کے بارے میں بھی یہ بات کہتا رہا ہے مگر اس اسلوب نے کمال پایا اور شاعر نے اپنے پڑھنے والوں کے ادبی ذوق کی تربیت کی۔ یہاں یکسانیت ہے تو یہ ندی کے بہاؤ کا قرار ہے۔ موضوعات اور مضامین کی پشت پر جو فکر و فلسفہ ہے، اس کا اطمینان ہے۔ یہ ظریفانہ سرمایہ ہر چند مختصر ہے مگر اس میں ہمارے عہد کے بعض اہم موضوعات اور دل پذیر

اسلوب شیر وشکر ہوکر ایک قابل مطالعہ، ایک قابل توجہ شاعری کے آہنگ میں ڈھل گئے ہیں۔فکر و فن اور موضوع واسلوب کی سطح پر زبیرالحسن غافل کے یہاں ایک عمومی توازن نظر آتا ہے جس کے سبب بہار کے قابل ذکر ظرافت نگاروں میں ان کا شمار کیا جاسکتا ہے۔

زبیرالحسن غافل کی ظریفانہ شاعری کے حصے میں مٹھی بھر غزلیں بھی ہیں۔غزل ایک ایسی صنف ہے کہ اس کے بغیر کسی شاعر کا کام نہیں چلتا۔سنجیدہ شاعر ہو یا ظریفانہ، ان غزلوں یا مزاحیہ غزلوں میں شاعر نے اردو کی عمومی ظرافت کو تو آزمایا ہی مگر صنف کی نزاکت کو ملحوظ رکھتے ہوئے کچھ بے حد دل پذیر شعر بھی سامنے آیا ہے۔زبیرالحسن غافل کی ایک غزل تو اس لائق ہے کہ اس کا ہر شعر برسرمحفل پیش کیا جائے۔چند اشعار ملاحظہ ہوں:

کیا بتاؤں حال اپنا جب سے شوہر ہوگیا
نصف بہتر وہ ہوئیں میں نصف بدتر ہوگیا
اپنا دامن جھاڑ کر تو ساس خوش دامن ہوئیں
بھوت جو چمٹا تھا ان سے، اب مرے سر ہوگیا

اس غزل میں مضمون آفرینی کے طور پر دو اشعار ملاحظہ کیجیے اور شاعر کی ذہانت اور منطقی مہارت کو ملاحظہ کیجیے:

گیٹ پر جنت کے یوں سخت چیکنگ تھی مگر
شیخ جی کا داخلہ اسٹاف کہہ کر ہوگیا
قاعدے کی رو سے تو تانیث ہونا چاہیے
پھر بھلا یہ مولوی کیوں کر مذکر ہوگیا

اسی غزل میں ہنستے کھیلتے شاعر سے یہ شعر سرزد ہوا:

اتنا ہنگامہ ہے کیوں یہ آدمی کیا چیز ہے
یہ تو ایسا دور ہے، اللہ بے گھر ہوگیا

اندازہ ہی نہیں ہوا کہ شاعر خوش گپیاں کرتے ہوئے شوہر بیوی اور شیخ اور مولوی پر طنز کے تیر چلاتے ہوئے اچانک اتنا سنجیدہ اور متین لہجہ اختیار کر لے گا اور عالم انسانیت کے مشکل

سوالوں سے نئے الجھاوے پیدا ہوں گے۔ بڑا اور اچھا ظرافت نگار اقبال کے لفظوں میں 'درد و داغ و جستجو و آرزو' کی بنیاد پر اپنے فن کا محل تیار کرتا ہے۔ ہر قلم کار چاہے جو بھی اسلوب اختیار کرنا پڑے، اسے جمعیت انسانی کے درد و سوز تک پہنچنا ہے۔ میر بھی وہیں تک پہنچے اور منٹو بھی اپنے کمال کے دوران اسی منزل کے طلب گار ہوئے۔ زبیر الحسن غافل بھی کہیں نہ کہیں اپنی ظرافت اور ہنسی مذاق کی آخری منزل سوز انسانی میں تلاش کرتے ہیں۔ کاش ان کی ہر غزل ایسے اشعار سے آراستہ ہوتی تو انہیں اردو کے معتبر ظرافت نگاروں میں لازمی طور پر شمار کیا جاتا۔

زبیر الحسن غافل کی شہرت اگر چہ ان کی ظریفانہ شاعری کے سبب ہوئی اور ایک عالم انہیں اسی حیثیت سے پہچانتا بھی ہے مگر وہ اول و آخر ظرافت نگار نہیں ہیں۔ ان کی ظرافت میں بھی حالات اور مضامین کے تئیں جو سنجیدگی دکھائی دیتی ہے، اس سے واضح اشارے ملتے ہیں کہ وہ کہ وہ فکر و دانش کی بنیاد پر وقوعات کو دیکھنے کا ملکہ رکھتے ہیں۔ اس لیے ان کے مجموعے میں زلیں، نظمیں بھی معقول تعداد میں موجود ہے جنھیں آپ سنجیدہ یا غیر ظریفانہ کے خانے میں رکھ سکتے ہیں۔ اسی کے ساتھ مقامی مجلسی ضرورتوں کے پیش نظر انہوں نے خاصی تعداد میں طرحی غزلیں کہیں ہیں۔ ان تمام چیزوں کو سامنے رکھتے ہوئے انھیں صرف ظریفانہ دائرے میں رکھ کر سمجھنا غیر مناسب معلوم ہوتا ہے۔ اس کلام میں بھی ان کی جہاں دیدنی اور غور و فکر کرنے کے ساتھ ساتھ روایتی شعر کو بہت حد تک نبھانے کا شعور نظر آتا ہے۔ جگہ جگہ بولتے ہوئے مصرعے اور معنوی تہہ داری سے لیس اشعار ہیں۔ شاعر کے معیار کی وضاحت کرتے نظر آتے ہیں۔ چند منتخب اشعار ملاحظہ کریں:

غافل کو ڈھونڈیے بھی تو پائیں گے اب کہاں
دیوانہ آدمی تھا نہ جانے کدھر گیا

میری پرواز کی رفعت کے آگے
حدیں سمٹی زمین و آسماں کی

گھروں سے اپنے جو نکلے تھے صبح میں یارو
بہت ہی کم تھے جو ان میں سے لوٹ کر آئے

روند ڈالے نہ کہیں انساں اسے

آسماں کو اور کچھ اونچا کرو
گماں یقیں کا سہارا اگر نہیں ہوتا
غم حیات سے گھبرا کے مر گئے ہوتے
نہ ہوتا گھات میں صیاد تو یقیں جانو
پرندے لوٹ کر اپنے ہی گھر گئے ہوتے
خوش نہ اتنا ہوئیے طوفان پھر طوفان ہے
کون جانے ساتھ اپنے کس کا گھر لے جائے گا

یہ اشعار کسی ایسے شاعر کی فکر کا نتیجہ نہیں جسے آپ منھ کا مزا بدلنے کے لیے شعر کہنا سمجھتے ہوں۔ ہر چند ان اشعار میں معروف، معاصر بعض کلاسیکی شعرا کی آواز بازگشت موجود ہے مگر اس سے کون محفوظ رہ سکا ہے۔ غالب نے کیا خوب رہنمائی کی تھی:

چلتا ہوں تھوڑی دیر اک راہ رو کے ساتھ

زبیر الحسن غافل بھی قابل اعتبار آوازوں سے ہم آہنگ ہونے کے لیے کوشاں نظر آتے ہیں۔ یہ کیفیت ان کی طرحی غزلوں میں بھی پورے طور پر موجود ہے۔ عام طور سے شعرا ورد ت کلام ثابت کرنے کے لیے ایسی غزلیں مقامی محفلوں میں پیش کرتے رہے ہیں۔ غافل صاحب نے بھی ایک مختصر مقدار میں استدہ فن کے مصرعوں پر غزلیں پیش کر کے اپنی کلاسیکی بصیرت کا اظہار کیا ہے۔ دوسروں کے اثرات قبول کرنے کا یہ انداز شعری مجموعے کے بھی آخری حصے میں بھی قائم ہے جہاں لیڈر خیالات اور جشن جمہور وغیرہ نظموں میں جوش اور اقبال کے اسلوب کی پیروی نظر آئے گی۔

زبیر الحسن غافل نے اپنی شعری مجموعے کا نام اجنبی شہر منتخب کیا۔ کتاب کا بالکل آخری کنارہ ایسی تخلیقات سے مکمل کیا گیا ہے جیسے کوئی۔۔رنگ صفحہ مرتب کیا جا رہا ہو۔ میر نے بھی کہا تھا:

دلی کے نہ تھے کوچے، اوراق مصور تھے
جو شکل نظر آئی، تصویر نظر آئی

میر خوش نصیب تھے کہ دلی پر ماتم کرتے ہوئے لکھنؤ پہنچے اور آرام سے گزر بسر کرتے ہوئے باقی ماندہ زندگی انجام تک پہنچانے میں کامیاب ہوئے۔ ہم، آپ اور زبیر الحس غافل کے

زمانے میں یہ لٹتی ہوئی اور لہولہان دلی اور ہر گاؤں اور شہر تک پھیل چکی ہے۔ اب کس کس دلی کا مرثیہ لکھیں۔ زبیرالحسن غافل نے اپنے مجموعے کے آخر میں ایسی ہی خوں آشام تحریریں پیش کی ہیں۔ اجنبی شہر اس اعتبار سے ان کی فکر کا نمائندہ ہے۔ یہ کوئی نیا شہر نہیں ہے جہاں ہم پیدا ہوئے اور مل جل کر ہم نے ایک خوابوں کا اپنا ملک بنایا مگر وقت نے اسے جینے کے لائق نہیں رکھا۔ جب اپنا گھر، اپنا شہر، اپنا ملک اجنبی معلوم ہو تو انسان پر کیا کچھ گزرتی ہوگی یہ سمجھا جاسکتا ہے۔ ان تمام کیفیات کو شاعر نے اس نظم میں پیش کر دیا ہے۔ اس موضوع کی توسیع نظم 'آس' میں بھی ملاحظہ کی جاسکتی ہے جہاں سب کچھ بدل جانے کے باوجود شاعر کو یہ محسوس ہوتا ہے کہ برگد کی چھانو میں ہماری اگلی نسلیں کھیل سکیں گی اور یہ امید اور بہتر دنا کا خواب اصل میں جینے کا ایک قیمتی ذریعہ ہے۔ جیسے زبیرالحسن غافل سخت حالات کے باوجود اپنے مالک حقیقی سے ملنے چلے گئے، کاش! ان کی فکر مندی اصحاب اقتدار پر اپنا کوئی اثر ڈال پاتی۔